کہانی ایک شہر کی

احمد عقیل روبی

احمد عقیل رُوبی

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی) ۔ لیک روڈ۔ لاہور

ھماری کتابیں .....

خُوبصورت، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین و اہتمام اشاعت

صفدر حسین

ضابطہ

اشاعت : جولائی ۱۹۹۵ء
مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس لاہور
تعداد : پانچ سو
قیمت : ۶۰/- روپے

انتساب

تاجل بیوس کے نام

ترتیب

صفحہ نمبر

ڈاکٹر انیس ناگی (لاہور)

دیباچہ

مجھے وہ ادیب بھاتے ہیں جو ادب اور کلچر کی مختلف سمتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں کبھی ادھر کبھی ادھر اور پھر کہیں نہ کہیں تکمیل کا راستہ نکل آتا ہے۔ فنی تکمیل ایک اتفاق ہوتا ہے۔ بعض کاوش سے اور بعض بغیر کاوش کے اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ بہرکیف اس کے لیے کوشش کی جانی چاہیے۔ ادیب کا ہمہ جہات ہونا ضروری ہے کیونکہ کوئی ایک صنف ادب شخصیت کے اظہار کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ اردو ادب میں ہمہ جہات ادیب کم تر دستیاب ہیں۔ ہر صنف ادب ایک امکان ہوتی ہے اور اس امکان کو بروئے کار لانا ضروری ہے۔ فی زمانہ ادیب کی ماہیت' ادیب کی مصروفیت اور اس کا اسلوب اظہار بھی بدل گیا ہے لیکن اردو ادب میں معاملہ مختلف ہے ہمارے غزل گو عمر بھر ایک ہی غزل کو لکھتے رہتے ہیں۔

ہمہ جہات ادیب وہ ہوتا ہے جو ذہنی طور پر توانا ہو اور جس کا قلم زندگی کے تجربات سے معمور ہو اور جسے تنوع میں رہنے کی عادت ہو۔ معاصر لکھنے والوں میں احمد عقیل روبی ان چند ایک میں سے ہے جو اپنے ادبی اور تمدنی پینترے بدلتا رہتا ہے۔ فلموں کے گیت اور کہانیوں کی تحریر' نماز اور قرآن مجید کا منظوم ترجمہ' اردو میں نظمیں' یونانی ادب کے تراجم' بچوں کے لیے نظمیں' خاکہ نگاری اور سوانح نگاری یہ سب کچھ عقیل روبی کی تخلیقی اقلیم کا حصہ ہے۔

عقیل روبی ایک ایسا ادیب ہے جو پیہم لکھتا رہتا ہے۔ پیہم لکھنا اپنے آپ کو ہر لمحہ دریافت کرنا ہے۔ ہماری ذات کوئی سربمہر چیز نہیں ہے۔ یہ ہر لمحے اپنے اردگرد سے بہت کچھ جذب کرتی رہتی ہے جس کا ہمیں عام طور پر وقوف نہیں ہوتا۔ جب ہم لکھتے ہیں تو ہمارے اندر سے بہت کچھ باہر نکلتا ہے جو اندر سرایت کر گیا ہوتا ہے۔ اس طرح ادبی تخلیق بیک وقت ہماری ذات کا' ہمارے عہد کا حوالہ ہوتا ہے' اس تک پہنچنے کا اور اس کو سمجھنے کا۔

عقیل روبی اس مرتبہ ایک نئے انداز میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ ایک برس میں اس کی چار کتابیں (نصرت فتح علی خان' باقر صاحب' ناصر کاظمی' کھرے کھوٹے) آگے پیچھے شائع ہوئی ہیں اور اب اس کی طویل نظم ''کہانی ایک شہر کی'' شائع ہو رہی ہے۔

عقیل روبی ان معاصر شعراء میں سے ہے جو طویل نظم لکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ پہلے اس کی طویل نظم ''سورج قید سے چھوٹ گیا'' شائع ہوئی تھی ۔ ہمارے بہت سے شعراء کا چند مصرعے لکھنے کے بعد سانس پھولنے لگتا ہے لیکن عقیل روبی میں طویل نظم لکھنے کا حوصلہ ہے۔ طویل نظم ہر طرح کی احتیاط کے باوجود عام طور پر بیانیہ میں ڈھل جاتی ہے کیونکہ ہر لمحے جذباتی ارتکاز کو برقرار رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے طویل نظم میں شاعر پینترے بدلتا رہتا ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کو دیکھ لیں۔

''کہانی ایک شہر کی'' میں کم و بیش پانچ سو کے قریب مصرعے ہیں جو ایک ہی بحر میں لکھے گئے ہیں لیکن نظم کی جذباتی حالت کے ساتھ ان کا آہنگ متغیر ہوتا رہتا ہے۔ یہ کہانی لاہور یا کراچی کی ہی نہیں ہے یہ تیسری دنیا کے کسی بھی شہر کی کہانی ہے جہاں بے انصافی اور حق تلفی کا دستور ہے۔ جہاں انسان کے وقار اور اس کی خودداری کو مسمار کیا گیا ہے۔ جہاں علم' آزادی اور سچائی کو زوال آ چکا ہے۔ جہاں مظلوم پس رہا ہے اور ظالم دندناتا پھر رہا ہے کیونکہ یہ غیر ہموار سیاسی نظاموں کی حکمت عملی ہے۔ عقیل روبی کی نظم عہد حاضر کا نوحہ ہے جس میں ایک نادیدہ مستقبل کا ویژن ابھر کر سامنے آتا ہے۔

اے شہرِ ویراں نوید ہو اب

کہ تیری مٹی سے نسلِ نو کا نمود ہو گا

جو تیرے دکھ کا علاج ہو گی

کہانی ایک شہر کی ایک حسن اور اس کی ویرانی کی تمثالیں ہیں جو نظم کے سیاق و سباق میں استعارے بن کر نظم کی معنوی توسیع کرتے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ عقیل روبی کی تمثالیں نظم کے اندر سے نمودار ہو کر باہر کی دنیا کا حصہ بن جاتی ہیں۔

کہانی ایک شہر کی

یہ رات کیسی ہے جو ہتھیلی پہ
تیرگی کا چراغ رکھے
قدیم برگد کے پاس بیٹھی
سکوت سے محو گفتگو ہے

قدیم برگد کی ٹہنیوں پر
خزاں رسیدہ شکستہ پتے
بہار کے خوش نما مناظر
سجا کے یادوں کے روزنوں میں
نہ جی رہے ہیں نہ مر رہے ہیں
ہوا کی آمد سے ڈر رہے ہیں

قدیم برگد کے پاس بیٹھی ہے رات
اور اس کے پاس رکھی
مہیب خوابوں کی پوٹلی سے
وہ خواب باہر لپک رہے ہیں
نہ جن کے منہ ہیں
نہ جن کے سر ہیں
یہ خواب رات آ کے شہریوں کی

اجاڑ آنکھوں میں ٹانکتی ہے
ہراس اور خوف بانٹتی ہے

بس اک اندھیرا
کرم زدہ اور مہیب خوابوں کے
تن بدن میں رچا ہوا ہے
یہ خواب چپکے سے رات آکر
اچھال دیتی ہے ان گھروں پر

ازل سے جن میں اسیر شہری
فصیلِ تنہائی چاٹتے ہیں
حیات کی قید کاٹتے ہیں
ازل سے یہ سلسلہ ہے جاری
ہے شہرِ ویراں پہ رات بھاری

یہ شہر بھی کس قدر عجب ہے
جہاں تنومند بلیوں کے
گلے میں گھنٹی بندھی ہوئی ہے
نحیف، لاغر، علیل چوہے
گلی، محلے میں دوڑتے ہیں

یہ شہر دست زمیں پہ رکھا
خمیدہ گلیوں کا ایسا مسکن ہے
جس میں خاموشی اور اداسی
کھلی نگاہوں سے آسمانوں کو تک رہی ہے

یہ شہر ایسا کھنڈر ہے جس میں
ہوا کی جھانجھ کبھی نہ چھنکی
نہ چاند نکلا
نہ پاؤں سورج نے اس میں رکھا
بس اک تعفن اور اک عفونت
قدیم، بوسیدہ، خستہ کمروں میں ہنس رہی ہے
گلی محلوں میں گرد پھیلی ہے تیرگی کی
گھروں میں رکھی ہوئی کتابوں کے
سارے الفاظ اڑ گئے ہیں
حروفِ فہم و خرد جو یادوں کے
جو طاقچوں میں لکھے ہوئے تھے
وہ مٹ گئے ہیں
نہ فہم و دانش کا ماہِ تاباں
نہ عقل و حکمت کی بزمِ یاراں
نہ ہے صدائے دلیل و معنی
اگر ہے کچھ تو فقط جہالت کی چیرہ دستی

یہ شہر ہے جس کے شہریوں پر
عذاب اترا تھا آسماں سے
جو آسماں نے دیا تھا ان کو
فرشتے آئے تھے
لے گئے ہیں
زمین کی کوکھ سے بہاریں
ہواؤں کی شانِ بے نیازی
کلی کے ہونٹوں کی مسکراہٹ
ابلتے چشموں کی گنگناہٹ
کنوئیں کا پانی
رفاقتوں کے طویل قصے
وہ بے رخی اور وہ مہربانی
وہ بچپنا اور وہ جوانی

یہ شہر اچھا تھا
عہدِ ماضی میں
اس کے ذرات ضو فگن تھے
لبوں کی خوشرنگ رہگزر پر
تھرک رہے تھے حروفِ شیریں
سروں کی سرگوشیاں تھیں ہر سو

سماعتوں کی خمیدہ گلیاں
بیان و معنی کی چاندنی سے
چمک رہی تھیں

ہر ایک صورت
ہر ایک چہرہ
مثالِ مہتاب ہنس رہا تھا
ہر ایک ماتھے کی سلطنت پر تھا قبضہ
خورشیدِ گرم رو کا
ہر ایک رستے پہ دونوں جانب
ہرے درختوں کی ٹہنیوں پر
ہوائیں بربط بجا رہی تھیں
زمیں کا سینہ ہرا بھرا تھا
ہر ایک ذرے کی کوکھ سے
پھوٹتے تھے چشمے
ذہانتوں کے فراستوں کے
کلی کی چھت پر
کھلے ہوئے تھے
ہزار ہا رنگ و بو کے پرچم
بہار کی کھڑکیوں میں بیٹھی بہ صد نزاکت
کلی کلی مسکرا رہی تھی

ہوا کے پیرون کی جھانجروں سے
برس رہے تھے وہ نغمے جن سے
سماعتوں کا جہاں بسا تھا
گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں
فہم و دانش کی
منڈلیوں میں
رموز و اسرار کہہ رہے تھے
کہ جس نے آنا ہے پاس آئے

"جو پوچھنا ہے وہ ہم سے پوچھے
زمینِ علم و ہنر میں بوئی ہے ہم نے دانش
جو چاہتا ہے کہ فصل کاٹے
وہ پاس آئے
اسے بتائیں گے ہم کہ کیسے
زمین سے پھوٹتا ہے سبزہ
یہ آسماں کیا ہے اس کے پیچھے
چھپی ہے کیا چیز
اور وہ کیا ہے؟
حیات کیا ہے؟ ممات کیا ہے؟
فلک کی کھیتی میں فصل تاروں کی
کون اگاتا ہے؟

اور وہ کیا ہے؟
زمیں، فلک، وادیاں، چٹانیں
ہیں کس کی ہمت سے ریزہ ریزہ
ہے کون وہ جس کے عزمِ زندہ سے

تختِ ظلم و ستم ہے لرزاں
اگر تم آؤ تو ہم بتائیں"

یہ عہد ماضی کا تذکرہ ہے
گئے دنوں کی ہے یہ کہانی

اب اس کے شہری
سروں پہ آتش کدے اٹھائے
دھوئیں میں اپنے بدن لپیٹے
ندی کے پانی میں پاؤں ڈالے
کھڑے ہوئے ہیں
نہ ہے گرہ میں زرِ سماعت
نہ کاسۂ چشم میں ہے چاندی
نہ لب ہیں گویائی سے شناسا
بس ایک ویران سا بدن ہے

سماعتوں کے تمام دروازے ہیں مقفل
لبوں سے گرتے ہیں لفظ ایسے
کہ جن کا مطلب
سوائے غوں غاں کے کچھ نہیں ہے
گلی محلوں میں دوڑتے ہیں
کچھ ایسے
جیسے بلوں سے چوہے نکل کے دوڑیں
غلاظتوں کے گٹڑ کی جانب

یہ لوگ ہیں
جن کی نفرتوں نے
کیا ہے مصلوب اس کو جس نے
کہا تھا ان سے
کہ سارے انسان ہیں برابر
نہ کوئی اکبر' نہ کوئی اصغر
تمام اک بوند سے لہو کی
چمن میں مہکے ہیں پھول بن کر
مگر یہ مانے نہ بات اس کی
وہ جب بھی بولا مذاق اڑایا
اگر رکا وہ تو سنگ برسے
چلا تو تھیں ہمرکاب اس کے

ہزاروں آوازیں نفرتوں کی
چھتوں سے اور کھڑکیوں سے برسے
ہزار ہا تیر گالیوں کے
نڈھال جب پیاس سے ہوا وہ
تو اس کو تپتی ہوئی زمیں پر
گھسیٹا اور پتھروں سے مارا
غصیلے کتوں کو اس پہ چھوڑا
مگر یہ کتے
جب اس کے زخمی بدن تک آئے
لہو کو سونگھا تو کپکپائے
لرز گئے جان کر یہ کتے
کہ سامنے ان کے جو پڑا ہے
یہ سارے انسان
چھوٹے چھوٹے ہیں یہ بڑا ہے
غصیلے کتوں نے احتراماً
اس آدمی کے
بدن سے رستے لہو کا ٹیکہ
جبیں پہ ٹانکا
بڑی محبت سے دم ہلائی
جبیں جھکائی
اور اس کے لاشے سے لوٹ آئے

یہ لوگ پھر بھی نہ باز آئے
غصیلے کتوں کو نوچ ڈالا
اس آدمی کے بدن پہ مٹی کا تیل چھڑکا
اسے جلایا تو چین آیا
یہ شہر کا وہ اجاڑ حصہ ہے
جس میں سوئے ہیں چاند سورج
وہ لوگ جن پر زمین نازاں تھی
اور تھا فخر آسماں کو
یہ لوگ تھے جن کی محنتوں نے
زمیں میں چاہت کے بیج بوئے
مشققوں کے پہاڑ کاٹے
گلی محلوں میں کھڑکیوں پر
چڑھائیں خلق و وفا کی بیلیں
ہجوم دیکھا تو آگے بڑھ کر
سروں پہ عطر و گلاب چھڑکا
یہ لوگ جب اس جہاں سے پلٹے
سفر کا جب وقت سر پہ آیا
تو مرد و زن کو قریب اپنے
بلا کے بولے

"ہماری اک بات یاد رکھنا
زمیں کے ہنستے ہوئے بدن کو
ہمیشہ جاں سے عزیز رکھنا
زمین ماں ہے تمہاری اس کے
نہ تن پہ کوئی خراش آئے
یہ شہرِ گل ہے اجڑ نہ جائے
حسد، تعصب، منافقت سے
وہ ساری بیلیں محبتوں کی
جو ہم نے خوں دے کے سبز کی ہیں
اگر جلائیں تو یاد رکھنا
عذاب اترے گا آسماں سے

جو حرف ہم نے کتابِ دل پر
لکھے ہیں ان سب کو یاد رکھنا
اگر بھلایا تو یاد رکھنا
عذاب اترے گا آسماں سے
اگر کوئی بھولا بھٹکا راہی
تمہارے گھر کے قریب آئے
خلوص کی چھاؤں میں بٹھانا
محبتوں کے ثمر کھلانا
اسے بتانا

اے آنے والے تمہارا آنا
ہمارے گھر اور ہماری خاطر
ہے وجہِ عزت، ہے وجہِ رحمت
نہ جھوٹ کہنا، نہ جھوٹ سننا
نہ سچ کو جھٹلانا زندگی بھر
نہ بیجنا دل کی کھیتیوں میں
اداس دن اور اداس راتیں
کسی کی پلکوں کی جھالروں میں
نہ آنسوؤں کے دیئے جلانا
نہ چاندنی میں دھواں ملانا
نہ اسلحہ کھیت میں اگانا
جو ہو سکے تو گھروں میں لوگوں کے
خواب پھولوں کے لے کے جانا
یہ حرفِ آخر ہیں حرفِ زندہ
انہیں بھلایا تو یاد رکھنا
عذاب اترے گا آسماں سے"

یہ بات، یہ حرفِ زندہ کہہ کر
وہ لوگ رخصت ہوئے جہاں سے
ہوا ہوئیں رونقیں مکاں سے

یہ لوگ جو آج اپنے پیروں میں
باندھے گرداب پھر رہے ہیں
یہ لوگ جو آج رو رہے ہیں
یہ کل ہنسے تھے
مذاق اڑایا تھا سب نے مل کر
بڑوں کا جو ہو رہے تھے رخصت
انہیں لحد میں اتارا، ان پر
اور ان کی باتوں پہ مٹی ڈالی
نہ ان کے جانے پہ آنکھ روئی
نہ حرفِ زندہ گرہ میں باندھے
اٹھے اور اٹھ کر مٹا دیئے
سب نقوشِ کہنہ
نشاں وفا کے، محبتوں کے، مروتوں کے
وہ سبز بیلیں جلائیں جا کر
تھا جن کے ریشوں میں خونِ الفت
جہاں کہیں فکر کی زمیں پر
اگا ہوا سبزۂ ہنر تھا، اسے جلایا
کتاب پھاڑی، قلم کو توڑا
ندی کے پانی میں زہر گھولا
اجاڑ کر کھیتیاں گلوں کی
خزاؤں کی کھاد ڈالی ان میں

چلائے ہل دشمنی کے مل کر
بموں کے، ٹنکوں کے بیج بوئے
پنیری بندوق کی لگائی
اگائے پھر گولیوں کے پودے

جو گھر بسے تھے وہ گھر اجاڑے
جہاں کبھی گیت گونجتے تھے
وہاں بجی گولیوں کی سرگم
گلی محلوں میں دندناتا
ہجومِ وحشت کا ریلا آیا
شریف شہری جو عزتوں کو
بچا کے گھر میں چھپے ہوئے تھے
انہیں سرِعام لے کے آئے
نزولِ بارود و اسلحہ سے
فروغِ علم و ہنر کو روکا
کتاب جس ہاتھ میں تھی
اس میں
تھما دی بندوق اور سکھایا
ہنر چلانے کا مارنے کا
بسے گھروں کو اجاڑنے کا
سروں سے پگڑی اتارنے کا

جو کم نظر تھے انہیں دیا تمغۂ بصارت
سرِ جہالت پہ تاج رکھا

بڑھایا زنداں کی رونقوں کو
جو اہلِ فہم و خرد تھے
ان پہ لگائی قدغن
کسی نے سچ کا علم اٹھایا
تو ہاتھ کاٹے
کسی نے اپنے حقوق مانگے
تو قتل گاہوں میں کھینچ لائے
کسی نے مانگا اگر تحفظ
سزا سنائی

قدم قدم پہ اجل نے اپنی دکان کھولی
حیات کا کاروبار اجڑا
نگل گئی امن و آشتی کو
اجل کی ڈائن
شرافتوں کو زوال آیا
عروج دیکھا رزالتوں نے
دھواں اٹھا صحن گلستاں سے
کلی کے دامن میں آگ بھڑکی

گھرا اگر کوئی دشمنوں میں
کسی کے دل میں نہ رحم آیا
بچانے اس کو نہ کوئی آیا
کوئی نہ آیا
تو آسماں سے عذاب آیا

عذاب آیا
تو ظلم کی سلطنت کو زوال آیا
زمین پر آ گئے فرشتے
جو شہر میں تھا وہ لے گئے سب
زمین کی کوکھ سے بہاریں
ابلتے چشموں کی گنگناہٹ
کنوئیں کا پانی
ہوا، کرن، چاندنی، ستارے
ابھرتے سورج کا روئے روشن

اجڑ گئے کھیت گولیوں کے
نشاں مٹے، ٹنک اور بموں کے
اگر بچے ہیں تو صرف یہ لوگ
جن کا جینا

ہے ایک الزام زندگی پر
نہ بولتے ہیں
نہ دیکھتے ہیں
نہ سوچتے ہیں
یہ نعمتیں چھن گئی ہیں ان سے
دھڑوں پہ خالی سروں کو رکھے
ادھر ادھر
پھر رہے ہیں مارے
اندھیرے کمروں میں جیسے چوہے
یہی سزا آسماں نے دی ہے
کہ اپنے پاپوں کا بوجھ اٹھا کر
جو ظلم سرزد ہوئے ہیں ان سے
گلے لگا کر
سروں پہ آتش کدے اٹھا کر
رہیں سلگتے یہ تا قیامت
نہ موت آئے نہ جی سکیں یہ

(ویران، اجاڑ اور سنسان شہر کے اس اداس ماحول میں ایک آواز گونجتی ہے)

نہیں نہیں فیصلہ یہ

اٹل نہیں ہے
عذاب یہ جاوداں نہیں ہے

زمیں کی مردہ رگوں میں
پھر موجزن ہے خوں کا بپھرتا دریا
زمیں کے اجڑے بدن میں پھر سے
وہ کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں
جو آنے والے دنوں کے گلشن میں
پھول بن کر مہک اٹھیں گی

زمین کی کوکھ
جس نے پالا ہے
جانے کتنے عظیم بیٹوں کو
جن کے فکر و عمل سے
تاریخ کی منڈیروں پہ روشنی ہے
یہ کوکھ پھر سانس لے رہی ہے
فلک سے پھر خوں کا ایک قطرہ
زمین کی کوکھ میں گرا ہے
جو نسل نو کے
حسین پیکر میں ڈھل رہا ہے
وہ نسل جس کی رگوں میں ہو گا

رواں لہو امن و آشتی کا
وہ بیج بوئے گے دوستی کا
اگائے گے باغ آگہی کا
گھروں میں پھر رونقیں سجیں گی
ہرے درختوں کی چھاؤں میں پھر
اگے کا فہم و خرد کا سبزہ

یہ شہر پھر سانس لے گا اک دن
ہوائے امن اور آشتی میں
جو کان بہرے ہیں پھر سنیں گے
اداس ہونٹوں کی رہگذر پر
حروف شیریں کا رقص ہو گا
ملے گی پھر آنکھ کو بصارت
جہالتوں کی شب سیہ میں
طلوع ہو گا خرد کا سورج
خزاں کی اجڑی ہوئی گلی سے
بہار نکلے گی گنگناتی
ذہانتوں کے کنول کھلیں گے
سجے گی فہم و خرد کی محفل
سرِ جہالت سے تاج
مٹی میں آگریں گے

گلی گلی میں سجے گی انصاف کی کچہری
جو حق کسی کا
کسی پہ ہو گا
وہ حق ملے گا

اے شہرِ ویراں نوید ہو اب
کہ تیری مٹی سے نسلِ نو کا نمود ہو گا
جو تیرے دکھ کا علاج ہو گی
نجات تجھ کو دلائے گی وہ
عذابِ پیہم سے آ کے اک دن
بس اور دو چار دن کا قصہ ہے
یہ اداسی
یہ غم اٹھا لے، عذاب سہہ لے
بس آمد آمد ہے نسلِ نو کی
بس آمد آمد ہے نسلِ نو کی

دلِ زار تو نے بہت خواب دیکھے

اپنی چھ سالہ دوست

MAHAM KHALID

کے لیے ایک نظم

جو چھوٹی عمر میں بڑے بڑے خواب دیکھتی ہے

دلِ زار تو نے بہت خواب دیکھے
کبھی تو نے دیکھا
کہ اڑتی ہوئی تتلیوں کے پروں پر
وہ آنکھیں، وہ لب، اور وہ چہرہ سجا ہے
جو تیرے دریچے میں اک شام
وعدے کا اک پھول رکھ کر
ہجومِ جہاں میں
کہیں کھو گیا تھا

کبھی تو نے دیکھا
کہ بل کھاتی پگڈنڈیاں جنگلوں کی
تجھے لے گئیں
برف کے ہاتھ پہ رکھے عشرت کدے میں
جہاں ابر دربان تھا

باندیاں بجلیاں تھیں
جہاں دستِ شبنم ترے پاؤں سہلا رہا تھا
جہاں مسندِ کہکشاں پر وہ چہرہ
ترا منتظر تھا

جو تیرے دریچے میں
وعدے کا اک پھول رکھ کر
ہجومِ جہاں میں کہیں کھو گیا تھا

دلِ زار تو نے بہت خواب دیکھے
کبھی تو نے دیکھا
کہ تو اس زمیں پر کھڑا ہے
جہاں ذرے ذرے میں سورج اگے ہیں
جہاں عدل کی گھنٹیاں زنگ آلودہ ہیں
جیل خانوں میں تالے پڑے ہیں
عدالت کے کمروں میں خاموشیاں سو رہی ہیں
جہاں لوگ خیرات لے کر کھڑے ہیں
کوئی لینے والا نہیں ہے

در و بام پر مہر و الفت کی بیلیں اُگی ہیں

جہاں علم و حکمت کی ٹھنڈی ہوا
درِ فکر پر دستکیں دے رہی ہے

دلِ زار تو نے بہت خواب دیکھے
مگر خواب جو میں کھلی آنکھ سے دیکھتا ہوں
وہ تو نے نہ دیکھا

نہ یہ تو نے دیکھا
کہ کیسے خزاں دستِ بے رحم میں
تیکھے ترشول لے کر
نہاں خانۂ لالہ و گل میں
مصروفِ کارِ ستم ہے
درو بام پر
قطرۂ خوں کی کاریگری ہے
عدل کی گھنٹیاں بج رہی ہیں
عدالت میں شور قیامت ہے
اور جیل خانوں پہ تالے پڑے ہیں
سحر کروٹیں لے کے جب جاگتی ہے

تو ہر کوئی ہاتھوں میں کشکول لے کر
سرِ راہ خیرات کا منتظر ہے
کوئی دینے والا نہیں ہے
علم کی تختیوں پر جہالت کی مٹی جمی ہے
فضیلت کی دستار جاہل کے سر پر سجی ہے
ہر طرف شور ہے' حشر ہے' بے کلی ہے

دلِ زار تو نے بہت خواب دیکھے
مگر خواب جو میں کھلی آنکھ سے دیکھتا ہوں
وہ تو نے نہ دیکھا

ہم درندے ہیں

بوسنیا کے ایک اجڑے گاؤں کے ویران گھروں سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ گلیاں سنسان ہیں' چاروں طرف لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ گلی کی نکڑ پر ایک درخت پر دو معصوم بچوں کے جسم شاخوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایک جوان خاتون جس کے چہرے پر ناخنوں کے نشان' کپڑے پھٹے اور بال بکھرے ہوئے ہیں۔ آنکھوں کی روشنی مدھم ہے اور ہونٹ سوکھے۔ وہ ننگے پاؤں بستی میں پھر رہی ہے۔ آخر لاشوں کے درمیان کھڑی ہو کر کہتی ہے:

عورت:

موت کی ڈائن لیے ترشول اپنے ہاتھ میں
اور چہرے پر حیا کے خون کا غازہ ملے
دندناتی پھر رہی ہے کوچہ و بازار میں
سر پہ رکھے ہیں لاکھوں جبر کی زنار میں

(عورت اجڑے' اداس اور جلے گھروں کی طرف اشارہ کرکے)

قبر کے ہم شکل گھر
بکھرے ہیں ہر کونے میں سر

فرش پر دھبے لہو کے
کھڑکیوں کی آنکھ نم
رفتگاں کے زخم سینے میں لیے دیوار و در

پوچھتے ہیں:

"کس نے دل کی تیز دھڑکن روک دی
کس نے آنکھوں میں جلے روشن دیے گل کردیے
کون شہرِ خواب میں عفریت بن کر آگیا
گل رخوں پر پھیر دی کس نے سیاہی موت کی
چھین لی کس نے لبِ یاقوت پر پھیلی ہنسی
کس نے بچوں کو سناں کی نوک سے زخمی کیا
کس نے لکھ دی دامنِ عصمت پہ تحریرِ ہوس
توڑ ڈالے کس نے دستِ ظلم سے تارِ نفس
کس نے بچوں کو جلا کر آتشِ بارود میں
کردیا تحلیل پل بھر میں فنا کے دود میں

(عورت پھر روتی ہے اور اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر ایک آہ بھرتی ہے اور کہتی ہے۔)

میرے دو بچے
میرے ماں باپ
شوہر اور بہن

ڈھونڈتی پھرتی ہوں
لاشوں میں کہیں ملتے نہیں

جس طرف جاؤں
مہذب ظالموں کی ٹولیاں
نوچ لیتی ہیں بدن کی ایک اک بوٹی میری
بجھ گئی ہے میرے جسمِ بے اماں کی کہکشاں
میرے چہرے پر لکھی ہے میرے غم کی داستاں
سینکڑوں وحشی درندوں نے کیا مجھ سے وصول
میرے ایماں، میرے تن، میری جوانی کا خراج
مل گیا مٹی میں پھول
ہوگیا تاراج میری عفت و عصمت کا تاج

(اپنے ہاتھوں سے منہ چھپا کر روتی ہے اور لاشوں کے پاس بیٹھ جاتی ہے)

میری ساری نسل کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی
زندگانی مرگ کے کہرے میں اوجھل ہوگئی

(اچانک دور سے کچھ امدادی ٹرک جن پر (U.N.O) کا نشان بنا ہے دکھائی دیتے ہیں جو بہت دور ہیں اور پھر وہ ایک سڑک پر مڑجاتے ہیں۔ وہ عورت غصے میں کھڑی ہوتی ہے اور ان کی طرف منہ کرکے کہتی ہے!

اے مہذب عالمِ اقوام کے چارہ گرو!
رہبرو، دانش ورو!
تم سے عالم کا سکون و امن و استحکام ہے
تم سے خوش سارے پرندے
اور سارے جانور
تم بناتے ہو درندوں کے لیے محفوظ گھر
نسل ان کی ختم ہونے کے قریب آئے اگر
حکم صادر دفترِ اعلیٰ سے ہوتا ہے
"سنو!

یہ پرندہ، یہ درندہ
جانور انمول ہے، ہشیار باش
جو اسے مارے گا پائے گا سزا سرکار سے"
اے مہذب عالم اقوام کے دانش ورو!
تیر اگر بطخ کے لگ جائے
تڑپ اٹھتے ہو تم
فاختہ کے پر پہ لکھتے ہو کہانی امن کی
کرتے ہو ان کی حفاظت آفت و آلام سے
رحم دل لوگو!
پرندے اور سارے جانور

کتنے خوش ہیں تم سے اور
تم ان سے کتنے شاد ہو
اے مہذب عالمِ اقوام کے دانشورو!
ہم کہ بنتِ آدم و حوا ہیں
ہم انسان ہیں
اور تعاقب میں ہمارے ہیں فنا کی ٹولیاں
توپ، بم اور گولیاں
قتل جاری ہے فنا کی تیغ سے انسان کا
مرگئے لاکھوں جو باقی ہیں قریب المرگ ہیں
نسل میری جبر کی بھٹی کا ایندھن ہوگئی
اے مہذب عالم اقوام کے دانشورو
جانور ہم کو سمجھ کر دو کوئی محفوظ گھر
ہم نہیں کہتے کہ ہم انسان ہیں
ہم درندے ہیں
ہماری نسل ختم ہونے کو ہے
ہم پرندے ہیں ہمارے آشیانے جل گئے
رحم دل لوگو!
ہمیں رہنے کو پنجرے چاہئیں
ہم درندے ہیں
ہماری نسل ختم ہونے کو ہے

رحم دل لوگو!
ہمیں رہنے کو پنجرے چاہئیں
(ٹرک آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔ عورت لاشوں میں بیٹھ کر روتی ہے۔)

یہ ہاتھ ہے میرے منّے کا

مُنّو بھائی کے لیے

(صبح کا وقت ہے شہر کے بارونق حصہ کا منظر نظروں کے سامنے ابھرتا ہے ہر طرف چہل پہل ہے۔ لوگ آ جا رہے ہیں۔ عورتیں مرد اور بچے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ اس ہجوم پر ایک آواز O/L ہوتی ہے)

آواز

یہ سانولے، سرخ، گورے، چہرے
سجائے ماتھے پہ محنتوں کا
حسین غازہ رواں دواں ہیں

ہر ایک چہرے کا جلتا سورج
زمینِ جاں پر چمک رہا ہے

نہ آنکھ میں غم کا گہرا سایہ
نہ کوئی شکوہ، گلہ، کسی سے
نہ نزدِ جاں وسوسوں کی آہٹ

ہجومِ محنت کشاں، رواں ہے
بس ایک دھن میں، بس اک لگن میں
کہ کیسے کوہِ گراں کو چیریں
کہ کیسے سیم و زرو و -----! جواہر
زمین کی کوکھ سے نکالیں
کرخت پتھر کے دل میں کیسے

حسین نقش و نگار بوئیں

یہ پاؤں میں گردشیں لپیٹے
ازل سے سوئے ابد رواں ہیں
یہ چل رہے ہیں، ہے ساتھ ان کے
زمیں، فلک، چاند اور ستارے
یہ استعارے ہیں زندگی کے
عمل کا مفہوم ان کے دم سے
ہر ایک راہی کی اپنی منزل
کسی کو علم و ہنر کی چاہت
کسی کی آنکھوں کو جستجو ہے
کہ لالہ و گل کے باغ ڈھونڈے
کوئی سفر پہ رواں دواں ہے
کہ قربِ منزل سے نور لے کر
جدائی کی تیرگی مٹائے
یہ کارواں سیلِ مرد و زن کا
ازل سے سوئے ابد رواں ہے
سجائے ماتھوں پہ محنتوں کا
حسین غازہ رواں دواں ہے

(بازار کا منظر آنکھوں سے فیڈ آؤٹ ہوتا ہے۔ اور سامنے شہنائی کی آواز کے ساتھ ایک شادی والا گھر ابھرتا ہے۔ شادی کا ہنگامہ ہے۔ دلہن رخصت ہو رہی ہے۔ دلہن کو سہیلیاں دعائیں دے کر رخصت کر رہی ہیں)

پہلی سہیلی

تمہیں خبر ہے کہ دل کی دھڑکن کے پالنے میں
تمہارے والد' تمہاری ماں نے
بہ صد محبت' بہ صد عقیدت
وفا کی لوری سنا کے تم کو جواں کیا ہے

تمہیں خبر ہے کہ بھائیوں نے
تمہاری راہوں میں چاند اتارے
تمہاری راتوں کو روشنی دی
تمہارے دن پیار سے نکھارے

دوسری سہیلی

تو جا رہی ہے یہ سب کھڑے ہیں
تمہاری یادیں گلے لگائے
تمہارا گھر ہو تمہیں مبارک
نیا سفر ہو تمہیں مبارک
دعا ہماری ہے ساتھ تیرے
کرے گی یہ دور سب اندھیرے
خدا نگہبان ہو تمہارا

ہو اس کی رحمت ترا سہارا
پرائے لوگوں میں جا رہی ہو
ہماری عزت کا خیال رکھنا

تیسری سہیلی

حیا کی تصویر بن کے رہنا
وفا کی تصویر بن کے رہنا
جو دیکھے تم کو یہی پکارے
یہ خود بھی اچھی، وہ گھر بھی اچھا
جہاں سے آئی ہے پیار لے کر
جہاں پلی ہے
جہاں بڑھی ہے
خدا نگہبان ہے تمہارا
ہو اس کی رحمت کا تم پہ سایہ

(دلہن رخصت ہوتی ہے۔ اور یہ منظر نگاہوں سے فیڈ آؤٹ ہوتا ہے دوسرا منظر ایک متوسط گھرانے کے آنگن کا ہے۔ جہاں ایک ماں اپنے بیٹے کو سکول کے لئے تیار کر رہی ہے بچے کی عمر ۴ یا ۵ سال کی ہے۔ باپ سائیکل لے کر کھڑا ہے۔ ماں بچے کو قمیض پہنا کر بٹن بند کرتی ہے اور ساتھ ساتھ کہتی ہے۔)

ریشماں

مرا منا چاند ستارا ہے

مری کشتی مرا کنارا ہے
دنیا کے تپتے صحرا میں
ٹھنڈے پانی کا چشمہ ہے
منے کی آنکھ میں ہنستے ہیں
سندر سپنوں کے اجیارے

(منا اپنے باپ کی طرف بڑھتا ہے۔ باپ اپنے بیٹے کا ماتھا چوم کر کہتا ہے۔)

باپ

منے کا یہ روشن ماتھا
میری خواہش کا سورج ہے
یہ پودا ہے امیدوں کا
جب سایہ دار شجر بن کر
یہ گلشن میں لہرائے گا
ہم اس کی چھاؤں میں بیٹھیں گے
دکھ درد کی تھکن اتاریں گے

(ماں منے کا بستہ سائیکل کے ہینڈل پر لٹکاتی ہے اور اس کے بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیر کر کہتی ہے۔)

ماں

پڑھ لکھ کر جب میرا منا
اعلیٰ افسر بن جائے گا

ترے سارے فکر مٹائے گا
پھر چاند سی دلہن لائے گا
یہ آنگن ناچے گائے گا
مرے دل میں سوئی ہر خواہش
انگڑائی لے کر جاگے گی
خوشیوں سے جھولی بھر دے گی
سب دور بلائیں کر دے گی

(باپ سائیکل پر بچے کو لے کر چلا جاتا ہے۔ ماں دروازے تک آتی ہے۔ پھر دونوں کو پیار سے دیکھ کر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہتی ہے)

ماں

ہم اس کی آس پہ جیتے ہیں
غم کھا کر آنسو پیتے ہیں
ہم دونوں کی یہ لاٹھی ہے
ہم دونوں کا یہ ساتھی ہے
اس پر تو اپنا سایہ کر
اس کی جھولی رحمت سے بھر
ہو نام زمانے میں اس کا
ہم بندے ہیں تو ان داتا
اونچا ، ہے سب سے نام ترا

اس پودے کو چھتنار بنا
مولیٰ سن لے ممتا کی دعا

(ماں دعا مانگ کر آنگن کی طرف پلٹتی ہے۔ باپ اور منا نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ منظر نظروں سے فیڈ آؤٹ ہوتا ہے۔ اور نظروں کے سامنے سکول کا سرسبز منظر ابھرتا ہے۔ جہاں پھولوں کے لان میں بچے کھیلتے پھر رہے ہیں اور ماسٹر انہیں محبت پیار سے دیکھ کر کہتا ہے۔)

ماسٹر

یہ کلیاں یہ کومل کلیاں
فطرت کے کورے کاغذ پر
سیدھی سادھی تحریریں ہیں
سچائی کی تصویریں ہیں
جگمگ جگمگ ان کے دم سے
اس دھرتی کا ویرانہ ہے

مستی ہے اور مے خانہ ہے
اس دھرتی کی مٹی' ان کے
دم سے چاندی' سونا' موتی
سانسوں سے مہکے پھلواری
کنجِ لبِ معصوم سے جاگے
آنکھیں مل کر صبحِ درخشاں

سر گوشی میں مدھم، کومل
سر جاگیں، لے، کروٹ بدلے
سانسیں لیتے لفظ ہیں یہ سب
لوحِ جہاں پر، فطرت جن سے
لکھتی ہے جیون کی کہانی
یہ بچے، یہ کومل بچے
آج کے دل میں بیج رہے ہیں
آنے والے کل کی فصلیں
مستقبل کی روشن کرنیں

یہ بچے یہ کومل بچے
تھام کے تیز ہوا کی انگلی
رنگ برنگی تتلی بن کر
لمحے لمحے کا رس پی کر
جانبِ منزل رواں دواں ہیں

(بچوں کی طرف اشارہ کر کے)

یہ میرے دن میری راتیں
مری سوچ سے پھوٹتی باتیں
دل کی زمیں سے اُگتے پودے

میری آنکھیں میرے بازو
میری فکر کا شیرازہ ہیں
شہر عمل کا دروازہ ہیں

(دعائیہ انداز میں)

پھولیں پھلیں آباد رہیں یہ
شاد رہیں آزاد رہیں یہ
لوحِ جہاں پر اپنے فن کی
مہر لگائیں اور ہوا کے
لب پر ان کا نام لکھا ہو
شہرِ جہاں میں دھوم ہو ان سے
بام و درودیوار پہ ان کا
نام لکھا ہو کام لکھا ہو
ان کے دروازے پہ دائم--!
سر کو جھکائے وقت کھڑا ہو

(ماسٹر جب یہ کہہ رہا ہے تو کچھ اجنبی سایوں کی موجودگی محسوس کرتا ہے۔ جو منہ ڈھانپے ہوئے ہیں اور سیاہ کپڑوں میں ملبوس ہیں وہ اس پورے منظر پر ایک اندھیرا سا چھیلا کے غائب ہو جاتے ہیں اور پھر اچانک ایک دھماکہ ہوتا ہے پورا اسکول ہوا میں اچھلتا ہے۔ ماسٹر گرتا ہے۔ بچے مرتے ہیں۔ ان کے بدن ہوا میں اچھلتے ہیں۔ سارے شہر میں دھواں چھا جاتا ہے۔ دھماکے بار بار ہوتے ہیں۔ آسمان سے آگ برستی ہے۔ قیامت کا سماں ہے

چاروں طرف آہوں سسکیوں کا ایک شور پھیل جاتا ہے۔ دھواں چھٹتا ہے تو ماسٹر کو چاروں طرف بچوں کے کٹے پھٹے اجسام نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے سامنے مردہ اور زخمی بچوں کا ایک ڈھیر دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ وہ خود بھی زخمی ہے لیکن اپنے سامنے لاشوں کا ڈھیر دیکھ کر اپنے زخم بھول جاتا ہے اور رو کر کہتا ہے۔)

ماسٹر

نہیں نہیں نہیں نہیں
یہ قتلِ جاں، نہیں نہیں
مری زمیں لہو لہو
فلک، فضا، دھواں دھواں
مرے مکاں، مرے مکیں
کٹے پھٹے، لہو میں تر
پڑے ہیں فرشِ خاک پر
ہرے بھرے حیات کے
چمن اجاڑ ہو گئے
کسی کا سر ہے کھائی میں
کسی کا دھڑ ہے راہ میں
کسی کے ہاتھ کٹ گئے
کسی کی آنکھ بجھ گئی
کسی کا لال کھو گیا
جہاں اجاڑ ہو گیا

اسکول کا منظر فیڈ آؤٹ ہوتا ہے اور شہر کا منظر نگاہوں کے سامنے ابھرتا ہے۔ چاروں طرف لاشیں بکھری ہوئی ہیں اور لہو میں تر لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں۔ ہر طرف افراتفری، ہنگامہ، شور، بھاگ دوڑ، کا سماں ہے۔ ماسٹر یہ قیامت کا منظر دیکھ کر کہتا ہے۔

یہ حشر ہے کہ قہر ہے
ہراساں سارا شہر ہے
جو گھر پناہ گاہ تھے
اجل کا روپ دھار کر
عذابِ جان بن گئے
مکیں مکان چھوڑ کر
چلے ہیں جانے کس طرف
ہیں آگ کے حصار میں
مکیں، مکان، رہگزر
بچیں تو کس طرح بچیں
رکیں تو گھر میں آگ ہے
چلیں تو ہر قدم پہ ہے
الاؤ جلتی آگ کا
ہر ایک رہگزر پہ ہے
اجل کا دام ناگہاں
اٹھائیں جس طرف نظر
کھڑی ہے مرگِ سنگدل

پرو رہی ہے دم بہ دم
سروں کے پھول ہار میں
برہنہ پا، برہنہ سر
حیات گردِ رہگزر
نہ پاؤں کے تلے زمیں
نہ سر پہ کوئی آسماں

(ماسٹر جھک کر بم کا ایک خول اٹھاتا ہے اور کہتا ہے)

بس آگ ہے اور اسلحہ

(بم کا خول وہ نفرت سے زمین پر پھینکتا ہے اور ٹھوکر مار کر کہتا ہے

یہ اسلحہ، یہ اسلحہ
یہ زندگی کی موت ہے
یہ قہر ہے، عذاب ہے
یہ دن میں کالی رات ہے
یہ دام ہے یہ گھات ہے
اسی نے موت بوئی ہے
اسی نے گھر جلائے ہیں
ملکیں اسی نے کھائے ہیں
اسی کے گرم ہاتھ نے

یہ رونقیں مٹائی ہیں
ہری بھری حیات کی
یہ کھیتیاں جلائی ہیں

(چلا کر اور چاروں طرف ہاتھ ہلا کر کہتا ہے

نہیں نہیں نہیں نہیں
ہمیں یہ اسلحہ نہ دو
ہمارے گھر کو نور دو
ہمیں حسین خواب دو
لبوں کو------- مسکراہٹیں
عطا کرو کہ یہ نہیں
یہ ٹینک توپ اور بم
یہ امن کے حریف ہیں
یہ موت کے سفیر ہیں
مٹا دو ان کو مار دو
تہہ زمین گاڑ دو
وگرنہ زیرِ آسماں
کبھی نہ لہلہائیں گی
یہ کھیتیاں حیات کی
کبھی نہ تھرتھرائیں گی

یہ تتلیاں وجود کی
کبھی نہ جھلملائے گی

یہ چاندنی نگاہ کی
کبھی نہ گنگنائے گی

یہ موج نور چاہ کی
کبھی نہ گیت گائیں گی

یہ فاختائیں پیار کی
کبھی یہاں نہ آئے گی

حسین رت بہار کی

خدا را ان کو مار دو

تہہ زمین گاڑ دو

یہ اسلحہ' یہ اسلحہ

یہ امن کا حریف ہے

یہ موت ہے عذاب ہے

(ماسٹر اس منظر سے آؤٹ ہوتا ہے۔ **ریشماں** کا خاوند بچوں کی لاشوں میں کچھ ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ ایک طرف اپنے بچے کی لاش دیکھ کر بڑھتا ہے لیکن اچانک ایک بم گر کر اس کی لاش کے پرخچے اڑا دیتا ہے۔ **ریشماں** اور اس کے خاوند کے سامنے صرف ان کے منے کا ہاتھ پڑا ہے۔ **ریشماں** اس ہاتھ کو اٹھاتی ہے اور گم سم وہاں سے آؤٹ ہوتی ہے یہ منظر یہاں ختم ہوتا ہے اور اجڑے ہوئے شہر کی مختلف گلیاں نظروں کے سامنے آتی ہیں جن میں سوائے آگ' دھوئیں اور بکھری ہوئی لاشوں کے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس اداس

منظر میں صرف ایک آواز گونج رہی ہے۔ یہ وہی آواز ہے جو آغاز میں گونجی تھی۔)

آواز

یہ شہر، شہرِ زندگی تھا

شہرِ موت بن گیا

یہ شہر جس کا ہر مکاں

مکیں کی چشمِ جاں کو مثلِ کہکشاں عزیز تھا

یہ شہر جس کے بام و در

دریچے، کھڑکیاں، ستوں

تھے وجہ راحت و سکوں

اجل کے ہاتھ کی لکھی کہانیاں لئے ہوئے

کھڑے ہیں رفتگاں کے سوگ میں بدن کو ڈھانپ کر

یہ شہر جس کی ہر گلی

سواری موت کی رکی

گھروں سے جو بھی شے ملی

اجل نے اس کو کھالیا

یہ شہر، شہرِ زندگی تھا

شہرِ موت بن گیا

(یہ منظر نظروں سے فیڈ آؤٹ ہوتا ہے۔ دوسرا منظر ابھرتا ہے زخمی آدمی یعنی

ماسٹر اداس کھڑا ہے چاروں طرف دھواں دھواں ہے۔ رات کا وقت ہے چاروں طرف ہو کا

اف کیسا ہُو کا عالم ہے
مردہ شہر کے اُجڑتے تن میں
ویرانی کی گرد جمی ہے

شہر کے گھر ہیں یا بدروحیں
اپنے سر گھٹنوں پہ رکھے
بے خوابی میں اونگھ رہی ہیں
در، دیوار، دریچے، آنگن
آگ اور شعلے پھانک رہے ہیں
گلی گلی کا زخمی چہرہ
بے کل، بے سدھ، ہانپ رہا ہے
پھولوں کے چہروں پہ خراشیں
شاخوں پر بارود کے دھبے
صحنِ چمن کے فرش پہ بکھرے
لالہ و گل کے نازک پیکر

خالی گھر، سنسان دریچے
گم سم آنگن، چپ، خاموشی
دیا مکان کا چھوڑ کے جلتا
کہاں گئے سب کہاں گئے ہیں

کہاں گئی رونق بستی کی
کہاں گئی باتوں کی خوشبو
کہاں گیا چہروں کا سونا
کہاں گئی ہاتھوں کی چاندی
کہاں گئے رفتار کے نغمے
کہاں گئی لے سرگوشی کی
کہاں گئیں پلکوں کی راتیں
کہاں گئے ہونٹوں کے سویرے
کہاں گئی سوتے بچوں کے
ہونٹوں پہ لکھی سچائی
کہاں گئے دستِ فطرت کے
ترشے ہوئے معصوم کھلونے
کہاں گئے وہ چہرے جن سے
دن کرنیں لے کر چڑھتا تھا
کہاں گئیں وہ پلکیں جن میں
تھک کر رات بھی سو جاتی تھی
کہاں گئی بے داغ جوانی
کہاں گیا بے عیب بڑھاپا
کہاں گئے سب، کہاں گئے سب

(یہ منظر فیڈ آؤٹ ہوتا ہے۔ شادی والے گھر دلہن کوثر کا دولہا اپنے اجڑے گھر کے آنگن میں کھڑا ہے۔ سب کچھ لٹ چکا ہے۔ چھت گری ہوئی ہے۔ دھواں اٹھ رہا ہے وہ بے سدھ پاگلوں کی طرح اداس لہجے میں کہتا ہے۔)

یوں شہرِ غم میں خاک اڑاتا نہ تھا کبھی
تم جیسا دیکھتے ہو میں ایسا نہ تھا کبھی
یوں تیرے بعد سو گئے سر ڈھانپ کر چراغ
جیسے ہمارے گھر میں اجالا نہ تھا کبھی
کل تک وہ شکل میرے مقابل سجی رہی
اب اتنا فاصلہ ہے کہ سوچا نہ تھا کبھی

(منظر فیڈ آؤٹ ہوتا ہے۔ شہر کے اجاڑ حصے میں جہاں تمام لٹے ہوئے لوگ جمع ہیں وہ پریشان ہیں ان کے درمیان میں دو سال کی زخمی بچی جس کا ایک ہاتھ نہیں۔ ایک آنکھ نہیں اور ایک بازو نہیں۔ اس بچی کو ایک مرد زمین سے اٹھا کر کہتا ہے۔)

آدمی

کس کا خون ہے یہ کس کے دل کی دھڑکن ہے
کس کے دودھ نے اس کا تن سیراب کیا ہے
کہاں ہے وہ سینہ جس پر سر رکھ کر اس نے
پریوں، گڑیوں اور پھولوں کے سپنے دیکھے
کہاں ہے وہ آنگن جس کے بے تاب لبوں نے
اس کے ننھے پیروں کے تلووں کو چاٹا

کہاں ہے وہ ماں جس کے جسم کا یہ ٹکڑا ہے
کون ہے اس کا اب یہ کس کے گھر جائے گی
اپنا آپ دکھا کر کس کو تڑپائے گی

(لوگوں کو دیکھ کر لنگڑی اور لولی بچی کو ہوا میں لہرا کر کہتا ہے)
ہے کوئی ایسا جو اس بچی کو اپنائے
اپنے گھر لے جائے

(لوگ چپ ہیں بلکہ بچی کی خوفناک حالت دیکھ کر ایک قدم پیچھے ہٹتے ہیں۔) ۔
مانا گونگی، لولی، لنگڑی، کانی ہے یہ
لیکن اپنے عہد کی ایک کہانی ہے یہ

(ابھی اس کی بات ختم نہیں ہوتی کہ **ریشماں** اور اس کا خاوند اس ہجوم میں داخل ہوتے ہیں وہ دونوں تقریباً پاگل ہو چکے ہیں۔ زخمی ہیں۔ **ریشماں** کے ہاتھ میں بچے کا کٹا ہوا ہاتھ ہے۔ وہ ہاتھ لہرا کر کہتی ہے۔)

ریشماں

یہ ہاتھ ہے میرے منے کا
جو میرے جسم کا حصہ تھا
جسے میرے دودھ نے پالا تھا
جسے میرے پیار نے سینچا تھا
یہ ہاتھ ہے میرے منے کا

اس ہاتھ پہ پھیلی ریکھائیں
کہتی ہیں منے کا جیون
ہے اتنے برس جتنے تارے
نیلے آکاش پہ ہنستے ہیں
یہ ہاتھ ہے میرے منے کا
وہ منا جو ہم دونوں کے
تاریک دنوں کا سورج تھا
جو میرے دل کی دھڑکن تھا
جو اس کی آنکھ کی جوتی تھا
یہ ہاتھ ہے میرے منے کا
اس ہاتھ نے جانے کتنے برس
میرا سینہ سہلایا ہے
میرے ہونٹوں کو نوچا ہے
میری زلفوں کو کھینچا ہے
یہ ہاتھ مگر اب ہلتا نہیں
میرا سینہ سہلاتا نہیں
میرے ہونٹوں کو چھوتا نہیں

(ایک آدمی کے قریب جاکر اسے منہ کا ہاتھ دکھلاتی ہے۔)

یہ ہاتھ ہے میرے منے کا

ہم دونوں' ہاتھ لئے کب سے
دھڑ اس کا ڈھونڈتے پھرتے ہیں
تم نے تو نہیں دیکھا اس کو
بالکل پھولوں سی رنگت تھی
چندا کی جوت تھی آنکھوں میں
ہونٹوں پہ گیت تھرکتے تھے
سانسوں میں پھول مہکتے تھے

(ایک دوسرے آدمی سے بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھتی ہے۔)
تم نے تو نہیں دیکھا اس کو
جس ہاتھ کا باقی حصہ ہم
گلیوں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں
گلیوں میں کیا کیا بکھرا ہے
اجسام بڑوں اور چھوٹوں کے
ٹکڑے ہاتھوں اور پیروں کے
اجسام کا ڈھیر لگا ہے مگر
منے کا جسم نہیں ملتا
تم نے تو نہیں دیکھا اس کو؟

(وہ آدمی نفی میں سر ہلاتا ہے۔ **ریشماں** مایوس ہو کر اپنے خاوند کا ہاتھ پکڑتی ہے اور کہتی ہے۔

اچھا ہم آگے چلتے ہیں
شاید کسی ڈھیر میں مل جائے
اس ہاتھ سے کٹا ہوا حصہ
جسے میرے خون نے پالا تھا
جسے میرے دودھ نے سینچا تھا

(دونوں جاتے ہیں اور لوگوں کے اداس چہروں پر منظر فیڈ آؤٹ ہوتا ہے۔ نیا منظر درختوں کے جھنڈ میں فیڈ ان ہوتا ہے۔ زخمی لوگوں کا ہجوم ہے ماسٹر بھی ان میں موجود ہے۔ ایک آدمی کہتا ہے۔)

آدمی

اس دھرتی میں مہر نہیں ہے
اس دھرتی میں پیار نہیں ہے
ہم نے اس کے سونے تن میں
باغ لگائے، پھول کھلائے
ہم نے اس کے سونے تن میں
اپنے لہو کے دیے جلائے
اپنے پسینے کی بوندوں سے
اس کے داغ اور دھبے دھوئے
اس کے پتھر پھول سمجھ کر
سانسوں کے دھاگوں میں پروئے
موڑ کے رخ بپھرے دریا کا

ہم نے اس کی پیاس بجھائی
لیکن اس کو لاج نہ آئی
اس کا صلہ کیا دیا ہے اس نے

(لوگوں کو سوالیہ انداز میں دوبارہ کہتا ہے)

اس کا صلہ کیا دیا ہے اس نے؟
یہی کہ اس نے اپنے بیٹے
روند دئے اپنے پیروں سے

پہلا آدمی

اس دھرتی پر مہر نہیں ہے

دوسرا آدمی

اس دھرتی پہ رحم نہیں ہے

تیسرا آدمی

جینا اب دشوار ہوا ہے
اس دھرتی پر موت اُگی ہے

(**دیشماں** اور اس کا خاوند بھی آ جاتے ہیں۔ اور ایک عورت جس کا شوہر مر گیا ہے۔)

ریشماں

میرا منا' میرا بچہ

ایک عورت

میرا شوہر' میری دنیا

میرا گھر' میرا سرمایہ

ریشماں

میری آنکھ کا نور کہاں ہے
میری دنیا دھواں دھواں ہے

(وہی آدمی جو پہلے بات کر رہا تھا کہتا ہے)

پہلا آدمی

کھا گئی سب کچھ بھوکی دھرتی
یہ دھرتی یہ ظالم دھرتی
بھوک اُگے گی اب بستی میں
آگ اور پیاس کی بارش ہو گی
اس کی آنکھ میں وحشی پن ہے
پہلے اس کے نرم بدن سے
پانی کے چشمے پھوٹے تھے
آج مگر اگلا ہے اس نے
آتش اور بارود کا لاوا

جس میں جل کر راکھ ہوئے ہیں

(باری باری ریشماں اور اس عورت کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے جس کا شوہر مر چکا ہے)

تیرا منا

تیرا شوہر

تیرا گھر' تیرا سرمایہ

(ریشماں پھر درمیان میں بولتی ہے)

ریشماں

میرا منا' میری دنیا

عورت

میرا گھر' میرا سرمایہ

(وہ آدمی جھنجھلا کر)

آدمی

کھا گئی بھوکی' ڈائن دھرتی

(ماسٹر کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن وہ آدمی سب کو مخاطب ہو کر کہتا ہے۔)

آؤ میرے پیچھے آؤ

جو باقی ہے اسے بچاؤ
چھوڑ دو اس دھرتی کا پیچھا
چلو کہیں دور اس نگری سے
چل کر دنیا نئی بسائیں
اس کی دہشت اور وحشت سے
جو باقی ہے اسے بچائیں
چلو کہیں جنگل میں چل کر
ایک نیا گھر بار بنائیں

ایک آدمی

بالکل ٹھیک کہا ہے اس نے
اس دھرتی پہ مہر نہیں ہے

سب مل کر

چلو چلو دور اس دھرتی سے
اس دھرتی پہ موت آگئی ہے
اس دھرتی پر رحم نہیں ہے
اس کی دہشت اور وحشت سے
اپنا جسم اور جان بچائیں
آؤ کہیں دور اس دھرتی سے
ایک نیا گھر بار بسائیں
چلو چلو، چلو چلو

(سب جانے لگتے ہیں ماسٹر آگے بڑھ کر انہیں روکتا ہے اور کہتا ہے)

ماسٹر

ٹھہرو جانے والو ٹھہرو
ایک نظر مڑ کے تو دیکھو
دھرتی کی اندھی آنکھوں میں
درد کا پانی تیر رہا ہے
جلے دریچے، اجڑے آنگن
سونی گلیاں، خالی کمرے
پتھریلی، کالی دیواریں
لہو سے تر زخمی دہلیزیں
اپنے دکھ چہروں پہ سجا کے
ایسے کھڑی ہیں جیسے کوئی
ہجر کے زہر کا پیالہ پی کر
تنہائی میں ڈوبتا جائے

(لوگ ایک پل کے لیے رکتے ہیں)

یاد کرو اس دھرتی ماں کی
کوکھ سے تم نے جنم لیا ہے
اس کی ہواؤں کی خوشبو سے

مہکے ہیں تن کے باغیچے
اس کی گود میں پلے بڑھے ہو
ماں کو چھوڑ کے کہاں چلے ہو؟

(لوگوں کے سامنے عاجزی سے ہاتھ پھیلا کر)

دیکھو آج تمہاری ماں کے
جسم سے لاوا پھوٹ رہا ہے
آگ کی بھوکی پیاسی ڈائن
اس کے تن کو چاٹ رہی ہے

(لوگ ذرا سا بڑھنے لگتے ہیں)

کہاں چلے ہو کہاں چلے ہو
ماں کا انت تو دیکھتے جاؤ

ایک آدمی

یہ ماں نہیں ہے۔ یہ ماں نہیں ہے
یہ ماں نہیں ہے
یہ ماں کا معصوم روپ لے کر
اجل کھڑی ہے

دوسرا آدمی

یہ کیسی ماں ہے

کہ اس نے بیٹوں کے جسم نوچے

تیسرا آدمی

یہ کیسی ماں ہے

کہ اس کے بیٹوں کو موت آئی

یہ کچھ نہ بولی

یہ ماں نہیں ہے۔ چڑیل ہے یہ

(ماسٹر ہاتھ ہلا کر)

ماسٹر

نہیں نہیں یہ ماں ہے ہماری

جس کے کومل تن کو اجل نے

جبر کے سحر سے ریکل دیا ہے

دشمن کی نادیدہ سازش

دیمک بن کر لمحہ لمحہ

اس کے بدن کو چاٹ رہی ہے

دہشت و خوف کی پیاسی جونکیں

اس کے خون کا قطرہ قطرہ

روزِ ازل سے چُوس رہی ہیں

(لوگوں پر اس کی باتیں اثر کرتی ہیں اور وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں ماسٹر بات جاری رکھتا ہے)

گھر گھر اس دشمن کی دہشت
گھر گھر اس کا خونی سایہ
گلی گلی اس سے خائف ہے
آنگن آنگن اس سے لرزاں
یہ دشمن ہم میں رہتا ہے

(یہاں اجنبی سائے لوگوں میں داخل ہوتے ہیں اور تاریکی کے سائے لہرا کر چلے جاتے ہیں۔)

لیکن آنکھوں سے اوجھل ہے
جو کرتا ہے وہ کرتا ہے
ماں کا اس میں دوش نہیں ہے

سب مل کر

ماں کا کوئی دوش نہیں ہے؟

ماسٹر

۔ہاں۔

ماں کا کوئی دوش نہیں ہے
ماں اس دشمن کے پنجے میں
تڑپ رہی ہے سسک رہی ہے

سب لوگ

تڑپ رہی ہے سسک رہی ہے؟
تڑپ رہی ہے سسک رہی ہے؟

ماسٹر

تڑپ رہی ہے سسک رہی ہے
ماں مظلوم ہے ماں بے بس ہے
جو کرتا ہے وہ کرتا ہے
ماں کا کوئی دوش نہیں ہے

(لوگ ماسٹر کی باتیں سن کر مشتعل ہو جاتے ہیں اور چلا کر کہتے ہیں)

سب لوگ

اس دشمن کی ایسی تیسی
کہاں ہے وہ دشمن بتلاؤ
ہم اس دشمن کے پنجے سے
ماں کا بدن آزاد کریں گے
کہاں ہے وہ دشمن بتلاؤ
نام بتاؤ، شکل دکھاؤ
ہم اپنے کمزور اور زخمی
تن پر اس کا وار سہیں گے
لیکن دشمن کے پنجے سے
ماں کا بدن آزاد کریں گے

ماسٹر

اس دشمن کا نام نہیں ہے

اس دشمن کی شکل نہیں ہے
وہ دشمن ہم میں رہتا ہے
لیکن آنکھوں سے اوجھل ہے

(اچانک ہجوم میں ماسٹر اجنبی سایوں کو دیکھتا ہے جو بجلی کی چمک میں نظر آتے ہیں
وہ لوگوں کو اشارے سے کہتا ہے)

ہاں یہ ہیں ہم سب کے دشمن
یہی ہیں اس دھرتی کے بیری
یہی ہیں موت اگانے والے
یہی ہیں خواب جلانے والے

(لوگ بھی انہیں دیکھتے ہیں۔ سائے دوڑتے ہیں۔ لوگ بھی انہیں پکڑنے کے
لئے ان کے پیچھے دوڑتے ہیں۔)

لوگ

بھاگو' پکڑو' دوڑو' مارو
یہ دشمن ماں کے دشمن ہیں
ان سے گن کر بدلہ لیں گے
ان سب کا جو ہم میں نہیں ہیں
پکڑو' دوڑو' بھاگو' مارو

(سائے دوڑنا چاہتے ہیں لیکن لوگ انہیں گھیر لیتے ہیں اور مارتے ہیں۔ ان کی

چیخیں چاروں طرف پھیلتی ہیں لیکن عورتوں اور مردوں کی آوازیں ان چیخوں سے زیادہ ہیں لوگ مارتے ہیں اور ساتھ ساتھ چلا رہے ہیں لیکن نمایاں آوازیں **ریشماں** اور اس عورت کی ہیں جس کا شوہر مرا ہے اور اس مرد کی جس کی بیوی مری ہے۔)

ریشماں

میرا منا، میری دنیا

عورت

میرا شوہر، میری محبت

میرا گھر، میرا سرمایہ

ایک مرد

میری دنیا، میری بیوی

(جب سائے کی آوازیں بند ہوتی ہیں تو ماسٹر کے چہرے پر خوشی لہراتی ہے۔)

ماسٹر

یہ دشمن، ماں کا دشمن تھا

جس نے ماں کے بیٹے مارے

کسی کی بیوی، کسی کا شوہر

کسی کا منا، کسی کی بیٹی

اب ماں کو کوئی خوف نہیں ہے

(لوگوں سے)

آؤ اب دشمن کا لاشہ

دور سمندر میں پھینک آئیں
ان کا نام و نشان مٹائیں
ان کے تعفن اور بدبو کو
اس بستی سے دور بھگائیں

(سب لوگ سائے کا لاشہ اٹھا کر سمندر میں پھینکنے جا رہے ہیں اور ساتھ ساتھ کہہ رہے ہیں)

ملں کے سونے تن میں ہم
پھر سے خواب بوئیں گے
پھر چمن اگائیں گے
پھر سے گھر بنائیں گے
شمع پھر جلائیں گے
ہر بلا و قہر سے
ماں کو ہم------- بچائیں گے
پھر چمن اگائیں گے
پھر سے خواب بوئیں گے
پھر سے گھر بسائیں گے

(لوگ جا رہے ہیں اور منظر آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہوتا ہے)

عقیل روبی کی نظم "کہانی ایک شہر کی" تیسری دنیا کے ہر اس شہر کی کہانی ہے جہاں علم و ہنر بے وقعت ہو چکا ہے اور معاشرہ نا انصافی کا شکار ہے ہم گذشتہ پچاس سال سے ایک عبرت ناک صورت حال سے دو چار ہیں ایک نا ختم ہونے والی رات اور عذاب کا تسلسل ہے۔ جس کا ادراک عقیل روبی نے اپنی نظم میں کیا ہے۔ ہم حقیقت اور عزم حقیقت میں تمیز کرنے کے اہل نہیں رہے اس احساس کے باوجود عقیل روبی نے ہمیں ایک نیا Vision دیا ہے۔ نئی نسل روشنی کی پیامبر بن کر ظاہر ہو رہی ہے اس اعتبار سے عقیل روبی نے ایک حیثیت سے کشف کا اعلان کیا ہے جو بامعنی بھی ہے اور غور طلب بھی۔

ڈاکٹر انیس ناگی

عقیل روبی کی تخلیقی توانائی' شدت احساس اور درد مندی نے ان سے کیا جاندار شہر آشوب لکھوایا ہے۔ ان کے جاگتے اور بولتے ہوئے لفظی پیکر پوری نظم میں سوگ کی' ماتم کی اور گریہ و زاری کی فضا بناتے چلے جا رہے ہیں اس حقیقت کے ادراک پر کہ آج کی اس کربلا میں "ایک حسین بھی نہیں" جو زندگی کی اعلیٰ اقدار اور روایات کو قتل ہونے سے بچائے۔ وہ خود بھی خون کے آنسو روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رلاتے ہیں۔ مصرع مصرع شاعر کے مبتلا ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔ بہر حال بنیادی طور پر عقیل روبی اثبات اور کشادگی کے شاعر ہیں۔ سو انہوں نے اپنی بات ایک Note Positive پر ختم کی ہے اور نسل نو کے حوالے سے آنے والے اچھے دنوں کی بشارت سنا کر اپنے پڑھنے والوں کو حوصلہ دیا ہے۔ ہمیں ان کا شکر گذار ہونا چاہئے۔

شبنم شکیل